عہد غزنویہ کی سیاسی اور ادبی صورت حال

وہ سلسلۂ حکومت جسے سلسلۂ غزنویہ کہا جاتا ہے، مشرقی ایران میں سامانی حکومت کے بعد برسر اقتدار آیا تھا۔ یہ موجودہ افغانستان کے شہر غزنہ یا غزنی یا غزنین سے نسبت کے سبب غزنوی یا غزنویہ کہلاتا ہے۔ اس سلسلۂ حکومت کا بانی الپتگین ہے، جو ایک ترک غلام تھا۔ سلسلۂ غزنویہ کا سب سے مشہور اور سب سے طاقت ور حکمراں محمود غزنوی گزرا ہے۔ اس خاندان کا آخری حکمراں خسرو ملک بن خسرو شاہ (۵۵۹-۵۸۳ھ/۱۱۶۳-۱۱۸۷ء) تھا، جسے غوریوں نے حکومت سے بے دخل کر کے سلسلۂ غزنویہ کی بساط اُلٹ دی۔

اس طرح دو صدی سے زاید تک خاندانِ غزنویہ کے متعدد سلاطین نے ایک وسیع و عریض علاقے پر حکومت کی اور ملک گیری و مملکت داری کے ساتھ اپنی وسیع و عریض قلمرو میں زبان و ادبیات فارسی کی ترویج و اشاعت کا جو اہم کام انجام دیا وہ تاریخ ادبیات ایران میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ سلسلۂ غزنویہ کے دورِ اوّل میں عنصری، فردوسی، فرخی، عسجدی اور منوچہری وغیرہ جیسے بڑے بڑے شعرا نظر آتے ہیں۔ اس دور میں غزنہ علم و ادب کا ایک بڑا اور اہم مرکز بنا۔ گزشتہ عہد کی طرح عہد غزنوی میں بھی فارسی شاعری کی اہم خصوصیتیں اس کے اسلوب کی سادگی اور روانی سے نمایاں ہیں۔ تعقید و ابہام اور دور از ذہن مضامین و خیالات سے پرہیز، رزم نگاری، مناظر فطرت کی عکاسی وغیرہ وغیرہ وہ نمایاں باتیں ہیں، جو اس عہد کی شاعری میں بھی پوری طرح منعکس ہیں۔ ایران میں رزمیہ شاعری کا شاہکار، ''شاہنامۂ فردوسی'' اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عہد کی قصیدہ گوئی میں جو غزلیہ عناصر ملتے ہیں وہ نہایت دلکش اور دل انگیز ہیں۔ اس عہد کی غزلیں بھی صاف و سادہ اور عام فہم ہیں۔

عہد غزنوی کی نثر بھی، شاعری ہی کی طرح سادہ اور رواں اور ہر قسم کی پیچیدگی اور ابہام سے پاک ہے۔ عہد غزنویہ میں ہی فارسی زبان و ادبیات نے ہندستان جیسے دور دراز علاقے میں رواج پایا اور رفتہ رفتہ ترقی کے منازل طے کیے۔ سلاطین غزنویہ میں خود محمود غزنوی نے اپنے دربار میں بڑے بڑے شعرا و ادبا اور علما و فضلا کو جمع کر رکھا تھا۔ اس

عہد کے دوسرے دور کے سلاطین نے اگرچہ سیاسی اعتبار سے کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں دیا لیکن شعر و ادب اور علوم و فنون کی ترقی اور سرپرستی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ مسعود سعد سلمان اور سنائی غزنوی اس عہد کے ایسے نامور شاعروں میں گزرے ہیں جن کی شاعری اور اسلوب نے بعد کے شعرا کو بھی متاثر کیا ہے۔ مسعود سعد سلمان کا زندانی شاعری میں خاص مرتبہ ہے اور سنائی غزنوی کی متصوفانہ اور عارفانہ شاعری کو چھٹی صدی ہجری تک شعرا نے نمونہ تقلید بنا رکھا ہے۔ اس عہد کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر ایسے کثرت سے اشعار کہے گئے ہیں، جن میں مختلف قسم کی اصطلاحات بروے کار لائی گئی ہیں۔ اس عہد کے شعرا میں عثمان مختاری، سید حسن غزنوی اور ابوالفرج رونی کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس عہد کی فارسی نثر میں جو نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے وہ قدیم نثر کی سادگی اور سلاست کا آہستہ آہستہ متکلف اور مصنوعی نثر میں تبدیل ہونا ہے، جسے عربی کا غالب اثر کہا جاسکتا ہے کیوں کہ تعلیم یافتہ طبقے میں عربی ادب کا بیشتر چلن تھا۔ دوسری وجہ دین مبین اسلام کی روز بروز ترقی و توسیع بھی ہے جو عربی آمیز فارسی نثر کے رواج کا سبب بنی ہے۔ اور اس طرح ایجاز کی جگہ اطناب نے لے لی۔ نثر کے درمیان اشعار کا استعمال کیا جانے لگا، جس کا مقصد زبان و بیان میں حسن و دلکشی اور تاثیر و اثر پیدا کرنا تھا۔ مجموعی طور پر اس دور کی فارسی نثر میں تین اہم اور قابل ذکر رجحانات دکھائی دیتے ہیں:

(۱) نثر مرسل، جس کا عمدہ نمونہ تاریخ بیہقی ہے۔

(۲) نثر مرسل اور نثر مصنوع کے مابین ایک الگ طرز نگارش، جس میں بیان کو پھیلانے کی خاطر مترادفات کا بیشتر استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسی نثر کا نمونہ کشف المحجوب میں ملتا ہے۔

(۳) نثر مصنوع، جس کا استعمال ادبی اور داستانی کتابوں میں ہوا ہے، جیسے کلیلہ و دمنہ۔

اس عہد کے قابل ذکر نثر نگاروں میں ابوالفضل بیہقی، ابوالمعالی نصر اللہ، ابوریحان بیرونی، اسدی طوسی وغیرہ شامل ہیں۔

عہد غزنویہ میں محمود غزنوی نے فارسی ادب کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، وہ یادگار ہیں۔ انھیں کے سبب اس دور کو فارسی علم و ادب کے لیے عہد زرّیں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محمود کے جانشینوں نے اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فارسی زبان و ادب کی ترقی کے لیے بہترین مواقع مہیا کیے۔ اس دور کے لکھنے والوں کی خدمتوں سے متاعِ علم و ادب میں زبردست اضافے ہوئے اور گویا اسے معراج کمال تک پہنچا دیا گیا۔

عہد غزنویہ کے چند معروف شعرا

عہد غزنویہ کے معروف شعرا میں فردوسی (پیدائش: ۳۲۹ھ/۹۴۰ء، وفات: ۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء یا ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء)، فرخی سیستانی (وفات: ۴۲۹ھ/ ۱۰۳۷ء)، عنصری (وفات: ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء)، منوچہری دامغانی: (وفات: ۴۳۲ھ/ ۱۰۴۰ء)، عسجدی (وفات: ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء) بڑی شہرت اور اہمیت کے حامل ہیں۔ اس عہد کے دوسرے دور کے شعرا میں ابوالفرج رونی (وفات: بین سالہای ۴۹۲ - ۵۰۸ھ/۱۰۹۸-۱۱۱۴ء)، مسعود سعد سلمان (وفات: ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء)، سنائی غزنوی (وفات: بین سالہای ۵۲۵ -۴۵ھ/ ۱۱۳۰-۱۱۵۰ء) اور سید حسن غزنوی (وفات: ۵۵۶ھ/۱۱۶۰ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہاں اس دور کے کچھ مشاہیر شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے۔

فردوسی طوسی

فردوسی کا نام ابوالقاسم اور تخلص فردوسی ہے۔ اس کے باپ کے نام اور اس کی تاریخ و مقام پیدائش میں اختلاف ہے۔ کسی نے اس کے باپ کا نام علی، کسی نے منصور، کسی نے اسحٰق اور کسی نے احمد بتایا ہے۔ اسی طرح فردوسی کے مقام پیدائش کی بابت بھی کوئی ایک رائے نہیں ملتی بلکہ تذکرہ نویسوں نے الگ الگ نام لکھے ہیں۔ کسی نے طوس کے قریۂ رزان کو، کسی نے باژ کو اور کسی نے طبران کو اس کا مقام ولادت بتایا ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ وہ طوس کا ہی رہنے والا تھا۔ اس طرح اس کی تاریخ پیدائش ۳۲۹ھ/۹۴۰ء یا ۳۳۰ھ/ ۹۴۱ء اور تاریخ وفات ۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء یا ۴۱۶ھ/ ۱۰۲۵ء بتائی گئی ہے۔ فردوسی نے ابتدا میں اپنے زمانے کے متداول علوم حاصل کیے اسی لیے اس کے نام کے ساتھ حکیم بھی لکھا جاتا ہے۔ فردوسی کا تعلق طوس کے ایک زمیندار خاندان سے تھا۔ وہ طوس کے جس گانو کا رہنے والا تھا، وہ اس کی مِلک میں تھا لہٰذا زندگی آرام و چین سے بسر ہوتی تھی۔ اسے ایران کی قدیم تاریخ سے گہرا لگاؤ تھا۔ فردوسی کی شہرت کا انحصار اس کی معرکۃ الآرا تصنیف شاہنامہ پر ہے، جسے اس نے شاعرانہ مہارت سے تیس سال یا پینتیس سال کی مدت میں پچاس ساٹھ ہزار اشعار میں نظم کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

بسی رنج بردم درین سال سی　　عجم زندہ کردم بدین پارسی

ایران میں شاہنامہ نویسی فردوسی سے پہلے اور بعد بھی موجود تھی لیکن کسی نے اس کام کو اتنی تفصیل اور دلجمعی سے انجام نہیں دیا، جتنا فردوسی نے۔ اور کسی کی تخلیق کو وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، جو فردوسی کے شاہنامے کے حصے میں آئی۔ فردوسی نے اپنے اسلاف کے کارناموں کو ضبط تحریر میں لاکر ان کا نام زندہ کر دیا ہے۔ فردوسی سے پہلے دقیقی نے بھی شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا تھا مگر ایک ہزار اشعار سے زیادہ نہ لکھ سکا۔ اس کی ناگہانی موت سے ایران کی

رزمیہ داستان کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ فردوسی نے اپنے وطن میں ہی شاہنامہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ایک عظیم کام تھا، جو کسی علم دوست بادشاہ یا امیر کی سرپرستی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا۔ فردوسی نے محمود غزنوی کی علم دوستی اور ادب پروری کا شہرہ سن رکھا تھا۔ اُس وقت محمود کے دربار سے عنصری، فرخی اور عسجدی جیسے باکمال شعرا وابستہ تھے۔ فردوسی کو شاہنامہ نظم کرتے ہوئے بیس سال ہو چکے تھے اور جگہ جگہ اس کی شہرت بھی پہنچ چکی تھی۔ سلطان محمود نے بھی اپنے درباری شاعروں کو شاہنامہ لکھنے پر مامور کیا تھا۔ جب اسے فردوسی کی بابت اطلاع ملی کہ وہ شاہنامہ نظم کر رہا ہے تو اس نے حاکم طوس کو خط بھیج کر فردوسی کو اپنے دربار میں بھیجنے کا حکم دیا۔ فردوسی کو شاہنامہ کی تصنیف کا حکم دیا گیا اور اس کے لیے ضروری ساز و سامان مہیا کرائے گئے۔ شاہنامہ کے ہر شعر کے لیے ایک ایک اشرفی، صلہ یا انعام طے پایا۔ فردوسی نے غزنین میں قیام کر کے شاہنامہ مکمل کیا اور صلے میں اختلاف پیدا ہو جانے کے سب محمود سے ناراض ہو کر اس کی ہجو کہی۔ یہ ہجو ایاز کے ذریعے محمود کی خدمت میں بھجوا کر وہاں سے نکل گیا۔ ایک مدت تک بے سروسامانی میں چھپتا پھرا اور پھر اپنے وطن طوس پہنچ گیا، جہاں کچھ دنوں علیل رہنے کے بعد وفات پا گیا۔ محمود اگرچہ فردوسی سے ناراض ہو گیا تھا لیکن اس نے حسب وعدہ فردوسی کا انعام اشرفیوں کی صورت میں بھجوایا مگر اُس وقت جب فردوسی کا انتقال ہو چکا تھا۔

فردوسی کو ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکا ۳۷ سال کی عمر میں فردوسی کی حیات میں ہی فوت ہو گیا تھا جب کہ لڑکی فردوسی کی وفات تک حیات سے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فردوسی شاہنامہ سے حاصل ہونے والے صلہ و انعام سے بیٹی کے لیے جہیز وغیرہ کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔

فردوسی ایک باکمال شاعر تھا۔ شاہنامہ کے علاوہ اس سے ایک اور مثنوی "یوسف و زلیخا" بھی منسوب کی جاتی ہے۔

شاہنامۂ فردوسی، قدیم ایران کی تاریخ اور واقعات کے بیان پر مشتمل ہے، جو ایک قومی شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا آغاز آفرینش عالم سے ہوتا ہے، جس میں ایرانی تہذیب و تمدن اور ایران کی عظمت پارینہ کو نہایت دلکشی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر شاہنامہ ایرانیوں کے عروج کی ایک طویل داستان ہے جو تین ادوار میں بیان کی گئی ہے:

عہد اساطیری : کیومرث سے لے کر فریدون تک

عہد زور آزمائی : کاوہ کے انقلاب سے رستم کے قتل تک

عہد تاریخی : عہد کیان کے اواخر سے لے کر اس کے بعد تک یہ عہد زیادہ تر رزمیہ داستانوں اور افسانوں پر مشتمل ہے۔

شاہنامہ میں چار تاریخی سلسلوں یعنی پیش دادیان، کیانیان، اشکانیان اور ساسانیان کا ذکر بھی ہے۔

محققین کا خیال ہے کہ فردوسی نے جن ماخذ کا استعمال کیا ہے ان سے نقل قول میں امانتداری کا اہتمام کیا ہے۔ اس نے قدرتی مناظر کی تعریف، میدانِ جنگ کے مناظر اور پہلوانوں، بہادروں اور سورماؤں کے اوصاف بیان کرنے میں نہایت مہارت اور قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ شاہنامہ میں جو عشقیہ واقعات بیان کیے گئے ہیں، اُن میں دلکشی اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔ فردوسی کا اسلوب بیان بہت صاف و سادہ اور رواں دواں ہے اتنی طویل نظم میں بہت کم ایسے اشعار ملتے ہیں، جنھیں سست یا رکیک و مبتذل کہا جاسکتا ہے۔ فردوسی نے ہر داستان کی ابتدا میں فلسفیانہ اور ناصحانہ مطالب بیان کر کے قاری کے لیے ایک ماحول بنا دیا ہے اور آخر میں اس داستان کا کوئی اخلاقی نتیجہ بھی نکالا ہے۔ اس نے بے شمار ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو اب استعمال نہیں ہوتے اور وہ الفاظ شاہنامے کے سبب ہی اب تک فارسی کا جز بنے ہوئے ہیں۔ فردوسی نے رستم جیسے کردار کی تخلیق کی اور اس میں زمانے کے تمام اوصاف بھر دیے۔ یہ شاعر کے خلاّقانہ ذہن کے سبب ہی ممکن ہو سکا ہے۔ اس نے ایسے مہتم بالشان واقعات کا انتخاب کیا، جس نے دنیا کی تاریخ میں انقلاب رونما کیے۔ شاہنامہ فردوسی میں جنگ کے واقعات جس زور و شور اور ہیجان کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں، وہ دلوں کو دہلا دیتے ہیں۔ فردوسی نے جنگ میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں اور آلات اور مختلف قسم کے جنگی کے داؤ پیچ کا ذکر کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، جس کے سبب شاہنامہ ایک رزمیہ شاہکار بن گیا ہے۔ واقعہ نگاری میں بھی فردوسی کو مہارت حاصل تھی۔ اس نے قدیم ایران کے تمدن کو تمام جزئیات کے ساتھ منعکس کیا ہے۔ جہاں رزمیہ عناصر کو برتا گیا ہے وہیں عشقیہ عناصر پر بھی خوب توجہ دی گئی ہے۔ مثلاً اس کتاب میں زال اور رودابہ کی داستانِ عشق جس خوبصورتی سے بیان ہوئی ہے، وہ فردوسی جیسے باکمال شاعر کا ہی حصہ ہے۔ صنایع و بدایع کے استعمال، پند و موعظت، فصاحت و بلاغت، سادگی و سلاست، مضمون آفرینی اور تخیّل کی زبردست کارفرمائی نے شاہنامہ کو ایک یادگار زمانہ تخلیق بنا دیا اور فردوسی کو دنیا کے عظیم شعرا کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ ذیل میں شاہنامہ کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

کشتہ شدنِ پیلِ سپید بہ دستِ رستم

رستم جب نو سال کا تھا تو جسمانی اعتبار سے بیس سال کے جوان کی برابری کرتا تھا۔ ہمیشہ باپ اور دوسرے بہادروں کے ساتھ رہتا تھا اور ان کی صحبتوں میں شرکت کرتا تھا۔ ایک رات ایک سفید ہاتھی جو زال کا مخصوص ہاتھی تھا، کسی طرح لوگوں کے درمیان آ پہنچا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب رستم نو سال کا تھا۔ وہ گہری نیند میں سویا تھا کہ

ہاتھی کی چنگھاڑ سن کر بیدار ہو گیا اور اس سے لڑنے نکل پڑا ہے۔ فردوسی نے رستم اور سفید ہاتھی کی لڑائی کی منظر کشی نہایت خوبی سے کی ہے۔ رستم اس لڑائی میں ہاتھی کو مار ڈالتا ہے۔

چنان بد کہ یک روز با دوستان — ہمی بادہ خوردند در بوستان
خروشندہ گشتہ دل زیر و بم — شدہ شادمان نامداران بہم
می لعل گون را بہ جام بلور — بخوردند تا در سر افتاد شور
سپہبد بہ سوی شبستانِ خویش — بیامد برآن سان کہ بُد رسم و کیش
تہمتن ہمیدون سرش پر شتاب — بیامد گرازان سوی جای خواب
بخفت و بہ خواب اندر آمد سرش — برآمد خروشیدنی از درش
کہ پیل سپید سپہبد ز بند — رہا گشت و آمد بہ مردم گزند
چون زان گونہ گفتارش آمد بگوش — دلیری و تندی درو کرد جوش
دوان گشت و گرز نیا بر گرفت — برون آمد و راہ اندر گرفت
کسانی کہ بودند بر درگہش — ہمی بستہ کردند بر وی رہش
کہ از بیم اسپہبد نامور — چگونہ گشاییم پیش تو در
شب تیرہ و پیل جستہ ز بند — تو بیرون شوی کی بود این پسند
تہمتن شد آشفتہ از گفتنش — یکی مشت زد بر سرو گردنش
برآن سان کہ شد سرش مانند گوی — سوی دیگران اندر آورد روی
رمیدند از آن پہلو نامور — دلاور بیامد بہ نزدیک در
بزد گرز و بشکست زنجیر و بند — چنین زخم از آن نامور بُد پسند
برون آمد از در بکردار باد — بدست اندرش گرز و سر پر ز داد
ہمی رفت تا زان سوی ژندہ پیل — خروشندہ مانند دریای نیل
نگہ کرد کوہی خروشندہ دید — زمین زیر او دیگ جوشندہ دید
تہمتن یکی نعرہ زد ہمچو شیر — نترسید آمد برِ او دلیر
چو پیل دمندہ مر او را بدید — بکردار کوہی برِ او دوید

بر آورد خرطوم پیل ژیان　　بدان تا بہ رستم رساند زیان
تہمتن یکی گرز زد بر سرش　　کہ خم گشت بالای کُہ پیکرش
بلرزید بر خود کُہِ بی ستون　　بہ زخمی بیفتاد خوار و زبون
بیفتاد پیل دمندہ ز پای　　تہمتن بیامد سبک باز جای
بخفت و چو خورشید از خاوران　　بر آمد بسان رخ دلبران
بہ زال آگہی شد کہ رستم چہ کرد　　ز پیل دمندہ بر آورد گرد
سپہبد چو بشنید زیشان سخن　　کہ چون بود آغاز کردار بُن
بدو گفت کای بچۂ نرّہ شیر　　بر آوردہ چنگال و گشتہ دلیر
بدین کودکی نیست ہمتای تو　　بہ فرّ و بہ مردی و بالای تو

فرخی سیستانی

نام ابوالحسن علی اور تخلص فرخی؛ والد کا نام جولوغ تھا۔ فرخی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ سیستان کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ امیر خلف بانو یعنی خلف بن احمد صفّاری کا ملازم تھا اور فرخی بھی سیستان کے ایک زمیندار کے یہاں ملازمت کرتا تھا۔ جب شادی کر لی تو اس کے اخراجات بڑھ گئے اور اس نے اپنے مالک سے تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی لیکن اس نے تنخواہ نہیں بڑھائی۔ فرخی نے دل برداشتہ ہو کر وہاں سے کام چھوڑ دیا۔ ابوالمظفر چغانی نامی چغانیوں کے امیر کی بابت فرخی نے سن رکھا تھا کہ وہ داد و دہش اور بخشش و انعام میں پیش پیش ہے چنانچہ فرخی نے اس کے دربار کا رُخ کیا۔ فرخی کو بچپن ہی سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ وہ دَف بھی بجاتا تھا۔ امیر ابوالمظفر کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ کر وہاں پہنچا لیکن اس وقت امیر موجود نہیں تھا۔ وہ داغگاہ میں تھا۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے:

با کاروانِ حُلّہ برفتم زسیستان
با حُلّۂ تنیدہ ز دل بافتہ ز جان

یہ قصیدہ اس نے امیر ابوالمظفر کے پیشکار خواجہ عمید اسعد کی خدمت میں پیش کیا۔ چہار مقالہ کی روایت کے مطابق خواجہ عالم و فاضل اور شعر شناس تھا۔ وہ فرخی کا بلند پایہ کلام سن کر اور اس کی ظاہری حالت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کلام اس دیہاتی کا ہے۔ اس نے بطور امتحان کہا کہ امیر، داغگاہ گیا ہوا ہے اور میں تمھیں وہاں لے چلوں گا۔ پھر اس نے داغگاہ کی تعریف بیان کی کہ وہ ایک نہایت پُرفضا مقام ہے تم اس کی تعریف

میں ایک قصیدہ کہہ کر لاؤ تو تمھیں امیر کے پاس لے چلوں۔ فرخی نے اسی رات داغگاہ کی تعریف میں ایک معرکتہ الآرا قصیدہ کہا، جس کا مطلع یہ ہے:

چون پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغزار
پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

خواجہ عمید اس قصیدے کو سن کر پھڑک اٹھا۔ اس نے فرخی کو ساتھ لیا اور امیر کی خدمت میں داغگاہ پہنچ کر فرخی کا تعارف کرایا اور بولا کہ اے امیر! آپ کے پاس ایک ایسا شاعر لایا ہوں کہ دقیقی کے بعد کسی نے ایسا شاعر نہیں دیکھا ہے۔ پھر امیر کی اجازت سے فرخی نے اپنے دونوں قصیدے اُسے سنائے۔ قصیدے سن کر امیر بہت خوش ہوا اور انعام میں عمدہ نسل کے بچھڑے یا بعض روایت کے مطابق گھوڑے یا ''گرگ'' یعنی گینڈے کا ایک گلّہ جس میں ۴۲ بچھڑے یا اختلافِ روایت کے لحاظ سے ۴۲ گھوڑے یا گینڈے تھے، عنایت کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے صلے دیے۔ اس کے بعد فرخی نے سلطان محمود غزنوی کے دربار کا رُخ کیا۔ شعر و شاعری اور موسیقی میں مہارت کے سبب سلطان محمود غزنوی کے دربار میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوا، جہاں اسے بے پناہ دولت و ثروت بھی حاصل ہوئی۔ وہ ہمیشہ محمود غزنوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے محمود غزنوی اور اس کے بیٹوں محمد اور مسعود کی مدح میں قصاید کہے۔ ان کے علاوہ اس نے چند دوسرے وزرا کی بھی مدح کہی ہے۔

فرخی ایران کے نامور قصیدہ گویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے کلام میں سادگی، روانی اور زورِ بیان ہے اور سہل ممتنع کی نمایاں صفت پائی جاتی ہے۔ فارسی میں سعدی شیرازی بھی سہل ممتنع کے ایک بے مثال شاعر ہیں لیکن ان کا زمانہ ساتویں صدی ہجری کا ہے جب کہ فرخی ان سے قبل پانچویں صدی ہجری کے نصف اوّل کا شاعر ہے۔

فرخی سیستانی نے قصیدہ، غزل، رباعی اور قطعہ غرض کہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کا دیوان تقریباً نو ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر قصاید شامل ہیں۔ اس کے قصاید، فارسی قصیدہ نگاری کا شاہکار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان قصاید سے اس کے عہد کے بہت سی تاریخی، سیاسی اور تہذیبی حالات و واقعات یکجا کیے جاسکتے ہیں۔ فرخی نے محمود غزنوی کی مہمات اور فتوحات کے مناظر بہ چشم خود دیکھے تھے جن کا اس نے موقع بہ موقع اپنے قصیدوں میں ذکر کیا ہے۔ اس کے قصیدوں میں واقعہ نگاری، اچھوتے مضامین، تغزل، صنایع لفظی و معنوی، انتخاب الفاظ و تراکیب اور موسیقیت کا بھرپور استعمال نظر آتا ہے۔

فرخی کی غزلوں میں بھی کم و بیش یہی اوصاف نمایاں ہیں۔ اس کی وفات ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں ہوئی۔ اس کا

دیوان تہران سے شائع ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام:

ہر بزرگی کہ بہ فضل و بہ ہنر گشت بزرگ　　نشود خُرد بہ بد گفتن بَہمان و فلان
گرچہ بسیار بماند بہ نیام اندر تیغ　　نشود کند و نگردد ہنرِ تیغِ نہان

عنصری

عنصری کا نام ابوالقاسم حسن بن احمد بلخی اور تخلص عنصری ہے۔ وہ پانچویں صدی ہجری کا معروف شاعر گزرا ہے۔ عنصری بلخ میں پیدا ہوا۔ والدین کے انتقال کے بعد تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ تجارت کے سلسلے میں ایک سفر کے دوران چور ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا۔ اس کے بعد اس نے علم حاصل کرنے کی طرف توجہ کی۔ پھر محمود غزنوی کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور بہت جلد اپنے عہد کے تمام شعرا میں ممتاز اور نمایاں ہوا۔ شاعری کی بدولت اس کی قدر و منزلت اور اس کے مال و دولت میں اضافہ ہو گیا۔ وہ سلطان محمود کے دربار میں ملک الشعرا کے عہدے پر فائز تھا اور بڑے بڑے شعرا اس کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے۔ اکثر سلطان محمود کے ساتھ سفر و حضر میں رہتا۔ اس کے بعض قصاید میں سلطان کے سفر کا ذکر ہے۔ وہ عالی ہمت اور بزرگ منش شاعر تھا۔ اس کے کلام سے بھی وقار و متانت صاف جھلکتا ہے۔

عنصری کے کلام میں اگرچہ غزلیات و رباعیات شامل ہیں لیکن وہ دراصل قصیدے کا شاعر تھا۔ اس کے قصاید دقیق معانی، نازک خیالات اور نئے نئے مضامین کے حامل ہیں۔ اسے عربی ادب اور علوم عقلی میں بھی درک حاصل تھا، جس کے نتیجے میں اس نے عربی کے بڑے بڑے شعرا کے کلام سے خوشہ چینی کر کے اپنے کلام کو دلچسپ اور معنی خیز بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ منوچہری دامغانی نے اس کی مدح میں جو طویل قصیدہ کہا ہے اس کے مطالعے سے بھی عنصری کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ منوچہری کے قصیدے کا مطلع ہے:

ای نہادہ بر میان فرق جان خویشتن
جسم ما زندہ بہ جان و جان تو زندہ بہ تن

عنصری نے درج ذیل مثنویاں بھی کہی ہیں۔

(۱) شاد بہر و عین الحیاۃ (۲) خنگ بت و سرخ بت (۳) وامق و عذرا

ان میں مؤخر الذکر مثنوی بہت مشہور ہے۔ یہ عہد انوشیرواں کے دو چاہنے والوں کا ایک قدیم عشقیہ افسانہ

جسے عنصری نے بحر متقارب میں مثنوی کے پیرایے میں نظم کیا تھا۔ یہ مثنوی ناپید ہے لیکن اس کے کچھ اشعار جابجا مل جاتے ہیں۔

عنصری کی وفات ۴۳۱ھ /۱۰۳۹ء میں ہوئی۔ عنصری کا فارسی رباعیات میں بھی خاص مرتبہ ہے۔ یہاں نمونۂ کلام کے تحت اس کی دو رباعیاں نقل کی جاتی ہیں:

نمونۂ کلام:

در عشق تو کس پای ندارد جز من　　بر شورہ کسی تخم نکارد جز من
با دشمن و با دوست بدت می گویم　　تا ہیچ کَست دوست ندارد جز من

شاہا ادبی کُن فلکِ بدخو را　　کہ آسیب رسانید رخِ نیکو را
گر گوی خطا رفت بہ چوگانش زن　　ور اسپ غلط کرد بہ من بخش او را

منوچہری دامغانی

ابوالنجم احمد بن قوص بن احمد معروف بہ منوچہری دامغانی۔ پانچویں صدی ہجری کے نصف اوّل کا معروف شاعر ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں البتہ یہ واضح ہے کہ فلک المعالی منوچہر بن شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دربار سے وابستگی کے سبب منوچہری تخلص اختیار کیا تھا۔ منوچہری مختلف علوم وفنون خصوصاً فارسی وعربی شعر وادب میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔

جب سلطان مسعود غزنوی نے ۴۲۶ھ / ۱۰۳۴ء میں نیشاپور سے گرگان اور مازندران پر چڑھائی کی تو اس وقت منوچہری کو اس نے رَے سے مازندران بلایا۔ منوچہری کو دربار غزنویہ میں وہ مقام ومرتبہ حاصل ہوا، جس کے سبب دوسرے اس سے حسد کرنے لگے۔

منوچہری دامغانی عہد غزنوی کا زبردست قصیدہ گو شاعر گزرا ہے۔ اس نے اپنے قصاید میں قدرتی مناظر کی جو عکاسی کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس عمل میں اس نے عرب شعرا کے کلام سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ وہ مناظر فطرت کے بیان میں جزئیات نگاری اور خوبصورت تشبیہات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کلام میں ایسے بے شمار عربی الفاظ اور تراکیب در آئے ہیں جو نامانوس اور دور از ذہن ہیں۔ البتہ یہ شاعر کا کمال ہے کہ اس نے اپنی قادرالکلامی کے سبب انھیں خوبصورتی سے کھپایا ہے۔ منوچہری کے کلام میں ایک خاص قسم کی انبساطی

کیفیت موجود ہے، جو قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ اس کے کلام میں رنج و غم کا گزر نہیں۔ وہ مسرت و شادمانی کا پیغامبر ہے۔ اس نے کائنات کے وسیع و عریض سبزہ زار سے خوبصورت پھولوں، خوش مزہ پھلوں، خوش الحان پرندوں، آبشاروں، کوہساروں اور مسحور کر دینے والے نغموں کا انتخاب کیا اور انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس نے نادر تشبیہوں اور اچھوتے افکار کو جس روانی سے پیش کیا ہے اس کی بدولت وہ فارسی شاعری میں ایک مخصوص اسلوب کا حامل شاعر بن گیا ہے لیکن بسا اوقات ان کی کثرت نے شعر کے حسن کو مجروح بھی کیا ہے۔ فارسی میں ''مسمط'' کی ایجاد بھی منوچہری کا ایک جدت پسندانہ عمل ہے۔ اس کی وفات ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء میں بتائی گئی ہے۔

نمونۂ کلام:

آمد نو روز و ہم از بامداد　　آمدنش فرّخ و فرخندہ باد
باز جہان خرّم و خوب ایستاد　　مرد زمستان و بہاران بزاد
ز ابر سیہ روی سمن بوی راد
گیتی گردید چو دار القرار

عَسجدی

ابونظر عبدالعزیز منصور مَروزی متخلص بہ عسجدی، عہد غزنویہ کا معروف شاعر شمار ہوتا ہے۔ وہ محمود غزنوی کا معاصر اور اس کا مدّاح تھا۔ اس کے حالات زیادہ تر پردۂ خفا میں ہیں لیکن تاریخوں سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ وہ سلطان مودود بن مسعود (۴۳۲-۴۴۰ھ/۱۰۴۰-۱۰۴۸ء) کے عہد سلطنت تک بقید حیات تھا۔ عسجدی قصیدہ گوئی میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ فتح سومنات کے موقع پر اُس نے ایک معرکۃ الآرا قصیدہ کہا تھا، جس کا ذکر تقریباً ہر تذکرے اور تاریخ ادب میں ملتا ہے، جس سے اس کی ہنرمندی، سخن پردازی اور قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ عسجدی کی وفات ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء میں ہوئی۔

نمونۂ کلام:

بارانِ قطرہ قطرہ ہمی بارم ابر وار　　ہر روز خیرہ خیرہ ازین چشم سیل بار
ز آن قطرہ قطرہ قطرۂ باران شدہ خجل　　ز آن خیرہ خیرہ دل من ز ہجر یار

ابوالفرج رونی

ابوالفرج رونی بن مسعود (وفات ۴۹۲ - ۵۰۸ھ/ ۱۰۹۸-۱۱۱۴ء کے درمیان) اواخر پانچویں صدی ہجری کا

معروف شاعر گزرا ہے۔ رونی کا شمار برصغیر کے اوّلین فارسی شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کا مولد نیشاپور کا ایک گانو ''رونہ'' بتایا جاتا ہے لیکن اس کی پیدائش اور نشو ونما لاہور میں ہوئی۔ بعض نے ''رونہ'' کو لاہور کے مضافات میں واقع ایک قریہ بتایا ہے۔ اس نے عربی صرف ونحو اور اپنے زمانے کے دیگر علوم وحکمت میں کمال حاصل کیا۔ رونی کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے کلام میں علمی اصطلاحات بہ کثرت استعمال کی ہیں اور سبک خراسانی میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ابوالفرج رونی نے سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی اور اس کے بیٹے سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی کے دربار میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا اور ان سلاطین کی مدح میں قصیدے کہے۔ رونی کا اصل میدان مدح نگاری ہے۔ مشکل اوزان، دشوار ردیفوں، عربی الفاظ وترکیبات، پیچیدہ مضامین، استعارہ وکنایہ اور دیگر صنایع شعری کے استعمال میں اسے یدطولیٰ حاصل تھا۔ مسعود سعد سلمان اور انوری نے اس کی تعریف کی ہے اور متاخرین شعرا نے اس کے اسلوب کی پیروی کی ہے۔ ابوالفرج نے شعرائے متقدمین کے اسلوب کی پیروی سے دامن بچایا ہے اور اپنے مخصوص افکار کو مخصوص انداز میں اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ اس کا کلام سادگی، صفائی اور روانی ودلکشی کا بہترین نمونہ ہے۔

نمونۂ کلام:

نو روز جوان کرد بہ دل، پیر وجوان را　　ایام جوانی است زمین را و زمان را
ہر سال در این فصل بر آرد فلک از خاک　　چون طبع جوانان جہان دوست، جہان را
بگرفت شکوفہ بہ چمن بر گزرِ باغ　　چونان کہ ستارہ گزر کاہکشان را
آن غنچۂ گل بین کہ ہمی نازد بر باد　　از خندۂ دزدیدہ فروبستہ دہان را

مسعود سعد سلمان

ہندستان کے قدیم فارسی گو شعرا میں مسعود بن سعد بن سلمان پانچویں صدی ہجری کے نصفِ دوم اور اوایل چھٹی صدی ہجری کا معروف شاعر محسوب ہوتا ہے۔ اس کے آبا و اجداد کا تعلق ہمدان سے تھا۔ مسعود سعد سلمان کی ولادت ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں لاہور میں ہوئی۔ اس کا خاندان ایک علمی خاندان تھا۔ اس کے اجداد سلطنت غزنویہ میں دیوانی کے منصب پر فائز رہ چکے تھے۔ خود مسعود سعد تعلیم سے فراغت کے بعد دربارِ غزنوی سے وابستہ ہوگیا۔ اس وقت سلطان ابراہیم غزنوی (۴۵۰-۴۹۳ھ/۱۰۵۸-۱۰۹۹ء) تخت سلطنت پر متمکن تھا اور جب ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء سیف الدولہ محمود بن ابراہیم کو ہندستان کا والی بنا کر بھیجا گیا تو مسعود سعد بھی اس کا ہم رکاب ہوگیا۔ سلطان ابراہیم نے تقریباً ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء میں کسی بات پر ناراض ہوکر اپنے بیٹے سیف الدولہ محمود کو اس کے ندیموں کے ساتھ جلاوطن کر کے قید

میں ڈلوایا تو مسعود سعد بھی ان کے ساتھ قید خانے میں ڈال دیا گیا اور سات سال تک ''دہک'' اور ''سُو'' کے قلعوں میں اور تین سال تک قلعۂ ''نائی'' میں محبوس رہا۔ سلطان کے ایک مقرب کی سفارش پر اسے قید خانے سے رہائی حاصل ہوئی۔ سلطان ابراہیم کی وفات (۴۹۳ھ/۱۰۹۹ء) کے بعد جب اس کا بیٹا مسعود (۴۹۳- ۵۰۹ھ / ۱۰۹۹ - ۱۱۱۵ء) تختِ حکومت پر بیٹھا تو مسعود سعد کو جالندھر کی حکومت نصیب ہوئی۔ مسعود سعد کو یہ حکومت، مسعود غزنوی کے وزیر ابونصر کی سفارش پر ملی تھی جب مسعود غزنوی کسی بات پر ابونصر سے خفا ہو گیا تو اس نے نہ صرف اسے وزارت سے ہٹا دیا بلکہ مسعود سعد سمیت ابونصر کے تمام قریبی لوگوں کو بھی جالندھر کی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا اور قید و بند کی مصیبت جھیلنی پڑی۔ مسعود سعد کے مال و منال ضبط ہو گئے اور اسے آٹھ سال تک قید خانے میں رہنا پڑا۔ پھر ایک مقربِ بارگاہ کی سفارش سے اسے قید خانے سے آزادی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ مسعود غزنوی کا کتابدار بن گیا۔ مسعود غزنوی کے بعد اس کے بیٹوں کے دور میں بھی وہ اسی عہدے پر برقرار رہا۔ دربار سے وابستہ ہونے کے بعد اس نے سلاطین غزنویہ کی مدح میں قصیدے کہے۔ مسعود سعد کو قصیدہ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے قید خانے کی زندگی میں جو قصاید کہے وہ ''حبسیات'' کہلاتے ہیں اور بہت معرکۃ الآرا ہیں۔ مسعود سعد کے قصیدوں میں تاریخی واقعات بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ مسعود سعد کی زندگی کے متذکرہ ناخوشگوار واقعے نے اس کے ذہن و دل پر ایسے گہرے اثرات مرتب کیے، جو اس کے کلام میں بھی نمایاں ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن اس طرح فارسی ادب میں چند ایسے یادگار قصیدوں اور نظموں کا اضافہ ضرور ہوا جو ناقدانِ شعر و ادب کے لیے اب تک باعث حیرت و استعجاب بنے ہوئے ہیں۔

مسعود سعد سلمان کا دیوان تقریباً سولہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں قصیدہ، مثنوی، قطعہ، غزل و رباعی غرض تمام اہم اصنافِ سخن کے بھرپور نمونے موجود ہیں۔ غزل گوئی میں اس نے طرزِ عنصری اور سبکِ خراسانی کی رعایت کی ہے۔ بڑے بڑے شعرا جیسے امیر معزی، ابوالفرج رونی اور رشیدی سمرقندی نے اس کی تعریف و توصیف کی ہے اور نظامی عروضی سمرقندی نے مسعود سعد کے کلام کی اثر انگیزی اور تاثیر کو اس کی زبردست قوتِ تخیل کا مرہون منت بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں اس کا کلام پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ہیں، مسعود سعد کی حیات میں ہی حکیم سنائی نے اس کا دیوان مرتب کیا تھا۔

مسعود سعد کا کلام فصاحت و بلاغت کا حامل ہونے کے ساتھ دل پسند اور موثر بھی ہے۔ اس نے مضمون آفرینی، لطیف و نازک خیالات کی پیشکش اور مناسب ترکیبات و تعبیرات و تمثیلات کے ذریعے اپنی شاعرانہ قدرت کا بخوبی مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے کلام خاص کر اس کے حبسیہ کلام کی اثر انگیزی ہر ایک کو متاثر کرتی ہے۔

مسعود سعد کی وفات تقریباً ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء میں ہوئی۔ اس کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام:

فہرستِ حالِ من ہمہ تارنج و بند بود　　از رنج ماند عبرت و از بند، پند ماند
لیکن بہ شکر گویم کز طبعِ پاکِ من　　چندین ہزار بیتِ بدیعِ بلند ماند

تاری از موی من سپید نبود　　چون بہ زندانِ مَلِک مرا بنشاند
ماندم اَندر بلا و غم چندان　　کہ یکی موی من سیاہ نماند

عہد غزنوی کی چند معروف نثری کتابیں

قابوس نامہ:

قابوس نامہ کا ایک نام "کتاب النصیحة" بھی ہے۔ اس کا مصنف عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن وُشمگیر بن زیار ہے۔ اس کا شمار آل زیار کے دانشور امرا میں ہوتا ہے۔ کتاب کا نام "قابوس نامہ" مؤلف کے نام پر ہے جو تاریخ میں قابوس دوم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مصنف نے اپنے بیٹے گیلان شاہ کی تربیت کے لیے یہ کتاب، ایک مقدمہ اور ۴۴ ابواب میں تالیف کی ہے۔ مصنف نے صراحت کی ہے کہ میرے بعد اگر میرا بیٹا حکمراں ہوا یا اس نے کوئی اور شغل اختیار کیا تو وہ اپنے فرائض کیوں کر انجام دے گا، اسی خیال کے تحت میں نے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ لشکر کشی، مملکت داری، سماجی آداب و رسوم اور مروّجہ علوم وفنون کے علاوہ اخلاق و معاشرت، تحصیل علوم، ورزش کے فوائد، والدین کے حقوق اور سیاست کے اسرار و رموز ـــــ غرض زندگی میں پیش آنے والے تقریباً تمام پہلوؤں کا اس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے۔ ہر باب میں موضوع کے لحاظ سے اپنی بات کو مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لیے مصنف نے بڑی تعداد میں حکایتوں کا سہارا بھی لیا ہے۔ ان میں اس کے اپنے تجربات بھی شامل ہیں۔ کتاب کا سال تالیف محققین نے ۴۵۷-۴۶۲ھ/۱۰۶۴-۱۰۶۹ء کے درمیان یا ۴۷۵ھ/۱۰۸۲ء بتایا ہے۔

قابوس نامہ کی نثر اپنے عہد کی رائج نثر یعنی نثرِ مُرسل کا عمدہ نمونہ ہے بالفاظ دیگر کتاب کی نثر، صاف و سادہ، رواں اور عام فہم ہے۔ یہ کتاب کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

تاریخ بیہقی :

تاریخ بیہقی عہد غزنویہ کی ایک معتبر تاریخی کتاب ہے۔ اس کتاب کے مصنف کا نام ابوالفضل محمد بیہقی (وفات: ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء) ہے۔ اصل کتاب کا نام ''تاریخ آل سبکتگین'' تھا جو خاندان سبکتگین کی حکومت کے آغاز سے لے کر ابراہیم بن مسعود غزنوی کی سلطنت کے اوائل تک کے تاریخی حالات و واقعات پر مشتمل تھی۔ یہ ایک ضخیم کتاب تھی لیکن اس وقت اس کا جو حصہ موجود ہے وہ مسعود غزنوی کی حکومت اور کچھ دوسرے تاریخی واقعات پر مشتمل ہے۔ اسی مناسبت سے اسے ''تاریخ مسعودی'' بھی کہتے ہیں۔ بیہقی نے حالات و واقعات کی نقل میں صحتِ مطالب کا خاص خیال رکھا ہے۔ اسے لکھتے ہوئے مصنف نے غزنوی دربار میں موجود اسناد اور دستاویزات سے بخوبی استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب میں تاریخی واقعات کے علاوہ اُس عہد کے شعرا و مصنّفین کی بابت بھی بیش قیمت اطلاعات موجود ہیں۔ سادگی بیان اور صداقتِ روایات کے ساتھ صاف و سادہ نثر نیز واقعات کے ذکر میں مؤلف کی بے لوثی کے سبب کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ قابوس نامہ کی طرح یہ کتاب بھی اپنے عہد کی فارسی نثر کا ایک عمدہ نمونہ کہی جاتی ہے۔ البتہ اس کتاب کی نثر یکساں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک حصہ بہت سلیس اور دوسرا حصہ کچھ پیچیدہ اور عربی آمیز نثر پر مشتمل ہے۔

دانش نامۂ علائی

دانش نامہ علائی معروف فلسفی اور حکیم شیخ الرئیس ابوعلی سینا (وفات ۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء) کی مشہور فارسی تصنیف ہے۔ اس میں منطق، الٰہیات اور طبیعات کے موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مصنّف نے اسے علاء الدولہ کاکویہ کی فرمائش پر تصنیف کیا تھا اسی لیے اس کتاب کو دانش نامۂ علائیہ یا حکمت علائیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ابوعلی سینا نے اس کتاب میں ہیئت، ہندسہ، حساب اور موسیقی کو شامل کرنا چاہا تھا لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے ایک شاگرد اور معروف ریاضی داں ابوعبید جوزجانی نے مذکورہ موضوعات کو شیخ کی مختلف کتابوں سے شامل کتاب کیا۔ لہٰذا کتاب کا آخری حصہ شیخ کے شاگرد کا مرتّب کردہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس کے طرز نگارش کے سبب ہے۔ ابوعلی سینا نے فلسفیانہ اصطلاحات کو سادہ اور عام فہم فارسی نثر میں پیش کیا ہے۔ ابوعلی سینا کی فارسی کتابوں میں ''دانش نامہ'' کے علاوہ رسالہ نبض، رسالہ نبوت اور معراج نامہ بھی شامل ہے۔

التفهيم لاوايل صناعة التنجيم

عہد غزنوی کی معروف علمی کتابوں میں التفہیم لاوایل صناعة التنجیم تالیف ابوریحان بیرونی (وفات:

۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) بھی شامل ہے، جو فارسی میں حساب، ہندسہ اور علم نجوم پر ایک بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مصنف نے اسے پہلے ریحانہ بنت حسین خوارزمی کی فرمائش پر ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں فارسی میں شہر غزنین میں تصنیف کیا تھا پھر خود مصنف نے ہی اسے عربی میں ترجمہ کیا۔ کتاب کا ایک بنیادی وصف یہ ہے کہ مصنف نے علم ریاضی کی ان فارسی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے، جو عہد ساسانی کے اواخر سے علم نجوم و ریاضیات میں استعمال کی جاتی تھیں۔ اس کتاب میں بعض اصطلاحیں سنسکرت کی بھی ہیں۔

زین الاخبار

زین الاخبار عہد غزنویہ کی ایک اہم تاریخی کتاب ہے۔ اس کے مصنف کا نام ابوسعید عبدالحئ بن ضحاک بن محمود گردیزی ہے۔ کتاب ابتدائے خلقت سے مودود بن مسعود غزنوی (۴۳۲-۴۴۰ھ/ ۱۰۴۰-۱۰۴۸ء) کی حکومت کے خاتمے تک کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے۔ حوادث عالم اور اقوام وملل کے رسوم و آداب بیان کرتے ہوئے اگرچہ مصنف نے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے لیکن اس کی نثر بہرحال سادہ اور رواں ہے۔ اس میں تکلف اور پیچیدگی کا کہیں گزر نہیں ہے البتہ عربی الفاظ کافی استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن اس سے روانی اور دلچسپی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ طرز نگارش قدیم اور عہد سامانیان کے اسلوب نگارش جیسا ہے۔ مصنف نے اسے ۴۴۲ھ/ ۱۰۵۰ء میں ۱۹ ابواب میں تالیف کیا۔ اس کا دوسرا نام ''تاریخ گردیزی'' ہے۔

عہد غزنوی کے چند معروف علما و فضلا اور نثر نگار

عہد غزنویہ کی فارسی نثر، عہد سامانیہ کی فارسی نثر کی تقلید کہی جاسکتی ہے جس کی اہم خصوصیت سادگی اور سلاست روانی ہے۔ اس عہد کے تمام نثر نگار، عربی زبان میں مہارت رکھتے تھے اس لیے ان کے یہاں اگر کچھ عربی آمیز جملے یا عبارتیں ملتی ہیں تو اسے اُس عہد کے اثرات سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ یہاں مذکورہ دور کے چند اہم لکھنے والوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

ابوعلی سینا

بوعلی سینا تاریخ اسلام و ایران کے مشہور عالم و فلسفی گزرے ہیں بلاشبہ انھوں نے علم نجوم، علم طب، علم ریاضی اور حکمت و فلسفہ جیسے علوم میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، جن کی بدولت اپنے عہد اور بعد کے زمانوں میں بھی انھیں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور شیخ الرئیس، حجۃ الحق، شرف الملک اور امام الحکما جیسے القاب سے یاد کیا

جاتا ہے۔

ابوعلی حسین بن عبداللہ معروف بہ ابن سینا، بخارا کے ایک گاؤں خُرمیشن یا اَفشنہ میں ۳۷۰ھ ۹۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ بخارا ہی میں علوم دینیہ ادبیات اور فقہ وحساب اپنے والد سے حاصل کیے۔ دس سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوگئے۔ ابوعبداللہ ناتلی سے منطق، ہندسہ اور نجوم کی تعلیم پائی اور بہت جلد اِن علوم میں خود استادی کے درجے پر فائز ہوئے۔ ابوعلی سینا روشن دل و دماغ اور قوی حافظے کے مالک تھے۔ انھوں نے عنفوان شباب میں سامانی بادشاہ نوح بن منصور کا علاج کیا اور بخارا میں موجود سامانیوں کے عظیم کتب خانے سے استفادے کا موقع حاصل کیا۔ شیخ نے اپنی زندگی میں بہت سفر کیے۔ بخارا سے گرگان، وہاں سے خراسان، ہمدان اور اصفہان گئے۔ انھوں نے اپنی بیش قیمت کتابیں سفر کے دوران ہی تالیف وتصنیف کیں۔ شیخ کی وفات ایک سفر کے دوران ۴۲۸ھ / ۱۰۳۶ء میں ہمدان میں ہوئی۔ اُن کی آخری آرام گاہ بھی وہیں ہے۔

ابوعلی سینا کی تصانیف کتاب الشفا، کتاب القانون فی الطب، کتاب اشارات اور کتاب النجات وغیرہ عربی زبان میں ہیں، جب کہ دانش نامۂ علائی، رسالہ نبوت، رسالہ معراجیہ یا معراج نامہ اور رسالہ نبض فارسی میں ہیں۔

ابوعلی سینا کو شعر و ادب کا بھی شوق تھا۔ ان کے عربی اور فارسی اشعار بھی موجود ہیں۔ ذیل میں ایک فارسی رباعی درج کی جاتی ہے:

دل گرچہ در این بادیہ بسیار شتافت　　یک موی ندانست ولی موی شکافت
اندر دلِ من ہزار خورشید بتافت　　و آخر بہ کمال ذرّہ ای راہ نیافت

ابوریحان بیرونی

معروف ریاضی داں، فلسفی اور منجم ابوریحان محمد بن احمد کی پیدائش ۳۶۲ھ / ۹۷۳ء میں خوارزم میں ہوئی۔ ابو ریحان کو بیرونی کہلانے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُن کی ولادت شہر خوارزم سے باہر کسی جگہ ہوئی تھی۔ دوسری وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ طویل مدت اپنے شہر خوارزم سے باہر رہے۔ غالباً اسی لحاظ سے خوارزم کے لوگ انھیں بیرونی کہتے تھے۔ بیرونی نے ابتدائی زندگی خوارزم میں گزاری اور وہیں ابتدائی تعلیمات حاصل کیں۔ وہاں سے قابوس بن وشمگیر کے دربار میں گرگان پہنچے۔ اس بادشاہ کے نام سے کتاب آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ (گزشتہ صدیوں کے باقی ماندہ آثار) عربی میں تقریباً ۳۹۰ھ/۹۹۹ء میں تالیف کی۔ یہ کتاب قدیم اقوام وملل کی تاریخ وتقویم سے متعلق ہے۔ اس کے بعد وہ خوارزم واپس آگئے اور کچھ عرصے تک ابوالعباس مامون بن مامون خوارزم شاہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ ابوالعباس

خود عالم و فاضل شخص تھا، جس نے بیرونی کی قدردانی میں کوئی کمی نہیں کی۔ بیرونی نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء میں محمود غزنوی نے خوارزم پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ وہاں زبردست قتل و غارت گری ہوئی۔ بہت سے لوگ گرفتار کیے گئے، جن میں ابوریحان بیرونی بھی تھے۔ گرفتار ہونے والوں کو غزنین لایا گیا۔ اس واقعہ کے بعد بھی بیرونی نے کئی بار خوارزم کا سفر کیا۔ بیرونی محمود غزنوی کے حملۂ ہندستان میں اس کے ساتھ تھے۔ سفر ہندستان کے دوران یہاں کے علما و فضلا سے انھوں نے ربط پیدا کیا اور سنسکرت زبان سیکھی اور ہند شناسی میں ایک معرکۃ الآرا کتاب عربی میں تالیف کی ہے۔ اس کتاب میں ہندستان کے علوم، مذاہب اور آداب و رسوم کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۷ء میں روسی مستشرق زخاو نے شائع کر دی ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ علی اکبر دانا سرشت نے تہران سے شائع کیا ہے۔

محمود غزنوی کی وفات (۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کے بعد بیرونی اس کے بیٹے مسعود کے دربار میں احترام کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے اور اپنے علمی کاموں میں مصروف رہے۔ بیرونی نے اپنی بہترین کتاب "**القانون المشهدی**" اسی بادشاہ کے عہد میں تالیف کی اور اس کے نام معنون کی۔ اس کتاب کا موضوع علم نجوم و ہیئت ہے۔ اس عربی کتاب میں گیارہ مقالے ہیں اور ہر مقالے کو چند ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بیرونی کی دیگر مشہور کتابوں میں **الجماهر فی معرفة الجواهر** بزبان عربی شامل ہے، جس کا موضوع سنگ شناسی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب "صیدنہ" طب کے موضوع پر ہے۔ **کتاب التفهیم لاوایل صناعة التنجیم** اور **کتاب الاستیعاب فی صنعة الاسطرلاب** بھی ان کی اہم علمی یادگاریں ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب اسطرلاب بنانے کے بہترین طریقے کے بارے میں ہے۔

ابوریحان بیرونی اپنے زمانے کے عظیم دانشور اور کئی زبانوں کے واقف کار تھے۔ ان کی اصل زبان اگرچہ خوارزمی تھی لیکن وہ عربی، فارسی، یونانی، ترکی، عبری، سُریانی اور سنسکرت سے بھی کافی آشنا تھے۔ وہ مؤرخ، مہندس، منجم اور ادیب کی حیثیت سے بھی عالمی ادب میں جانے جاتے ہیں۔ انھیں شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی، جس کی مثال کتاب "الصیدنہ" اور "الجماہر" میں شامل اُن اشعار سے ہوتی ہے جو انھوں نے بطور مثال درج کیے ہیں۔ فارسی نثر میں ان کی روش سادہ نویسی کی تھی، جو سامانی عہد کی فارسی نثر سے قریب ہے۔ بیرونی نے ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں غزنین میں وفات پائی۔

ابوالفضل بیہقی

ابوالفضل بیہقی، یہ محمود غزنوی اور مسعود غزنوی کے دربار میں منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے نیشاپور

میں تعلیم و تربیت حاصل کی اس کے بعد محمود غزنوی کے دربار میں رئیس دیوان رسائل ابونصر مُشکان کی زیرِنگرانی ملازمت میں رہے۔ محمود غزنوی کے بیٹے عبدالرشید کے دورِ حکومت میں دارالانشاء کی پوری ذمّے داری بیہقی پر تھی لیکن حاسدوں نے نہ صرف عبدالرشید کو قتل کر دیا اور اس کے بہت سے ملازمین کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا بلکہ بیہقی کو بھی ان کے عہدے سے معزول کرا دیا اور قید خانہ کی راہ دکھا دی۔ یہاں تک کہ ۴۴۴ھ/ ۱۰۵۲ء میں بیہقی کو اس مصیبت سے نجات ملی۔ رہائی کے بعد انھوں نے اپنی بقیہ زندگی گوشۂ تنہائی میں بسر کی یہاں تک کہ ۴۷۰ھ/ ۱۰۷۷ء میں اس دنیا سے چل بسے۔ ''تاریخ بیہقی'' کے علاوہ ابوالفضل کی ایک اور تصنیف ''زینۃ الکتاب'' کا ذکر ملتا ہے، جو آدابِ کتابت یا خطوط نویسی سے متعلق تھی لیکن اب موجود نہیں۔